عظمتِ صوم

حدیثِ قُدسی ”فَاِنَّہٗ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ“ کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

اَلصَّوْمُ لِیْ

جملہ عباداتِ اسلامی —— صلوٰۃ وزکوٰۃ اور صوم و حج —— میں سے عبادتِ صوم کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس کے بارے میں متعدد روایات کی رُو سے‘ جن میں بخاری اور مسلم کی متفق علیہ روایت بھی شامل ہے‘ ایک حدیثِ قُدسی میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں کہ:

((اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ))(۱)

”روزہ خاص میرے لیے ہے اور میں خود ہی اس کی جزا دوں گا۔“

جنہیں بعض لوگوں نے اعراب کے ذرا سے فرق کے ساتھ یوں بھی پڑھا ہے کہ:

((اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اُجْزٰی بِہٖ))

”روزہ خاص میرے لیے ہے اور میں خود ہی اس کی جزا ہوں!“

---

(۱) روزہ کے بارے میں حدیث قدسی کے مندرجہ بالا الفاظ متفق علیہ ہیں‘ یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں موجود ہیں:

(۱) صحیح بخاری کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ ؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ ((قَالَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ : کُلُّ عَمَلِ ابْنِ آدَمَ لَہٗ اِلَّا الصِّیَامَ فَاِنَّہٗ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ ......))

(۲) صحیح بخاری کی ایک دوسری روایت میں حسب ذیل الفاظ وارد ہوئے ہیں:

((یَتْرُکُ طَعَامَہٗ وَشَرَابَہٗ وَشَھْوَتَہٗ مِنْ اَجْلِیْ ‘ اَلصِّیَامُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ......))

(۳) صحیح مسلم کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

((کُلُّ عَمَلِ ابْنِ آدَمَ یُضَاعَفُ :اَلْحَسَنَۃُ بِعَشْرِ اَمْثَالِھَا اِلٰی سَبْعِ مِائَۃِ ضِعْفٍ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:اِلَّا الصَّوْمَ فَاِنَّہٗ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ‘ یَدَعُ شَھْوَتَہٗ وَطَعَامَہٗ مِنْ اَجْلِیْ......))

(بحوالہ ریاض الصالحین ‘ للامام النووی)

یہاں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا نماز اللہ کے لیے نہیں؟ اسی طرح کیا زکوٰۃ اور حج اللہ کے سوا کسی اور کے لیے ہیں؟ ظاہر ہے کہ ان سوالوں کا جواب صرف نفی ہی میں دیا جا سکتا ہے۔ قرآنِ حکیم کے واضح ارشادات ہیں:

١۔ ﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ (١٤)﴾ (طٰہٰ)

”اور قائم کر نماز میری یاد کے لیے!“

٢۔ ﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ (٢٣٨)﴾ (البقرۃ)

”محافظت کرو نمازوں کی اور خاص طور پر نماز وسطیٰ کی‘ اور کھڑے رہو اللہ کے لیے پوری فرمانبرداری کے ساتھ!“

٣۔ ﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ﴾ (آل عمران: ٩٧)

”اور لوگوں کے ذمّے ہے اللہ کے لیے حج بیت اللہ‘ جو کوئی بھی استطاعت رکھتا ہو اس کے سفر کی۔“

٤۔ ﴿وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ﴾ (البقرۃ: ١٩٦)

”اور پورا کرو حج اور عمرے کو اللہ کے لیے۔“

٥۔ ﴿اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (٩)﴾ (الدھر)

”ہم کھانا کھلاتے ہیں تمہیں صرف اللہ کی رضا جوئی کے لیے‘ اور تم سے طالب ہیں نہ کسی جزا کے اور نہ شکریے کے!“

اس اشکال کا ایک سطحی سا حل بعض حضرات نے اس طرح کرنے کی کوشش کی ہے کہ روزے میں ریا ممکن نہیں ہے جب کہ بقیہ تمام عبادتوں میں ریا کا امکان ہے‘ اس لیے کہ روزے کی کوئی ظاہری صورت نہیں ہے جو لوگوں کو نظر آ سکے بلکہ وہ ایک راز ہے عبد اور معبود کے مابین۔ ظاہر ہے کہ یہ توجیہہ بالکل بے بنیاد ہے‘ اس لیے کہ نماز میں ریا یہی تو ہے کہ پڑھے تو انسان نماز ہی لیکن **خالصةً لِوَجهِ اللّٰه** نہ پڑھے بلکہ اس میں لوگوں کو دکھانے کی نیت شامل ہو جائے‘ بعینہٖ یہی معاملہ روزے کے ساتھ بھی ممکن ہے — رہی دوسری انتہائی صورت کہ انسان روزے سے نہ ہو اور لوگوں سے کہے کہ میں روزہ سے ہوں تو یہ ریا نہیں دھوکا اور فریب ہے اور اس کے مقابل کی صورت نماز کے معاملے میں یہ ہو گی کہ کوئی ظاہراً تو نماز کے لیے دست بستہ کھڑا ہو جائے لیکن بجائے سورۃ الفاتحہ کے کوئی عشقیہ اشعار شروع کر دے۔ یا نعوذ باللہ من ذالک‘ اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کو گالیاں دینا شروع کر دے! — پھر ایک نص قطعی کے طور پر موجود ہے وہ حدیث بھی جس کی رُو سے آنحضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

((مَنْ صَلّٰى يُرَائِىْ فَقَدْ اَشْرَكَ وَمَنْ صَامَ يُرَائِىْ فَقَدْ اَشْرَكَ وَمَنْ تَصَدَّقَ يُرَائِىْ فَقَدْ اَشْرَكَ)) (رواهُ احمد، مشکوۃ باب الریاء والسمعۃ)

''جس نے نماز پڑھی دکھاوے کے لیے وہ شرک کر چکا، اور جس نے روزہ رکھا دکھاوے کے لیے وہ شرک کر چکا، اور جس نے خیرات دی دکھاوے کی غرض سے وہ بھی شرک میں ملوث ہو چکا!''

اس حدیثِ قُدسی کا یہی وہ اشکال ہے جس کے باعث یہ عام واعظین کے مواعظ میں تو بیان ہو جاتی ہے لیکن اسلام کے جدید 'مفکّرین' کی تحریر و تقریر میں بار نہیں پاتی۔ اس لیے کہ واقعہ یہی ہے کہ دین کے بہت سے دوسرے لطیف تر حقائق جیسے عہد الست، وَحی، الہام، کشف اور رُؤیائے صادقہ وغیرہ کی طرح اس حدیثِ قُدسی کی حقیقت بھی ان لوگوں پر منکشف نہیں ہو سکتی جو دَورِ حاضر کے مادّہ پرستانہ اور عقلیّت پسندانہ رُجحانات کے زیر اثر رُوحِ انسانی کے جسدِ خاکی سے علیحدہ مستقل وجود اور جداگانہ تشخص اور اُس کے ذاتِ باری کے ساتھ خصوصی ربط و تعلق کے یا تو سرے سے قائل ہی نہیں ہیں یا کسی درجے میں ہیں بھی تو اُس کے اعتراف و اعلان میں جھجک اور حجاب محسوس کرتے ہیں! — بقول اکبرؔ الٰہ آبادی:

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں کہ اکبرؔ نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

اس لیے کہ اس حدیثِ قدسی کی واحد ممکن توجیہہ یہ ہے کہ روزہ روح کے تغذیہ و تقویت کا ذریعہ ہے جسے ایک تعلق خاص اور نسبت خصوصی حاصل ہے ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ، لہٰذا یہ گویا خاص اللہ کے لیے ہے جس کی جزا وہ بطورِ خاص دے گا۔ یا یوں کہہ لیں کہ چونکہ اس کا حاصل ہے تقرب الی اللہ تو گویا اللہ خود ہی بنفسِ نفیس اس کی جزا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ 'ارواحِ انسانی' کا ایجاد و اِبداع 'اجساد' کی تخلیق سے بہت پہلے ''جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَۃٌ'' (مُسلم عن ابی ھُریرہؓ) کی صورت میں ہوا اور حضرت آدم علیہ السلام کی عالم اجساد میں تخلیق سے بہت قبل، خود ان کی اور ان سے لے کر تا قیامِ قیامت پیدا ہونے والے تمام انسانوں کی ارواح مستقل جداگانہ تشخص اور پورے شعورِ ذات اور فیما بین جملہ امتیازات کے ساتھ موجود تھیں۔

اس حقیقت کے ادراک و شعور کے بغیر، واقعہ یہ ہے کہ عہدِ الست کا وہ اہم واقعہ جسے قرآن مجید نے بڑے اہتمام اور شدّ و مدّ کے ساتھ بیان کیا ہے اور جسے محاسبہ اخروی کے ضمن میں ایک اہم حجت قرار دیا ہے یا تو محض تمثیل و استعارہ قرار پاتا ہے یا پھر اس کے بارے میں اچھے اچھے مصنفین کے قلم سے بھی نادانستہ انتہائی لغو اور مہمل جملے نکل جاتے ہیں۔ (۱) سیدھی سی بات یہ ہے کہ یہ عہد اجسادِ انسانی کی تخلیق

---

(۱) مثلاً مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں: ''یہ اقرار انسان کے وجود میں آنے سے پہلے ہی عالم غیب میں خدا نے اس سے لیا ہے۔'' (تدبر قرآن، جلد سوم، صفحہ ۳۹۴)

سے قبل عالمِ ارواح میں ارواحِ انسانی نے پورے ہوش اور شعور کے ساتھ کیا اور میدانِ حشر میں جب تمام نسلِ انسانی دوبارہ⁽¹⁾ ”جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَۃٌ“ کی صورت میں اپنے خالق کے سامنے پیش ہوگی تو یہی عہدِ الست ان کے خلاف حجتِ اولیٰ کے طور پر پیش ہوگا! (”مبادا تم کہنے لگو قیامت کے دن کہ ہم کو اس کی خبر ہی نہ تھی یا یوں کہنے لگو کہ اصل میں تو شرک کا ارتکاب کیا تھا ہم سے بہت پہلے ہمارے آباء و اَجداد نے اور ہم تو بعد میں ان کی نسل میں پیدا ہوئے تھے!“ سورۃ الاعراف‘ آیات ۱۷۲‘۱۷۳)

اسی طرح اس حقیقت کو جانے اور مانے بغیر کوئی توجیہہ ممکن نہیں ان متعدد احادیث کی جن سے واضح ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نہ صرف یہ کہ خلق کے اعتبار سے سب پر مقدم ہیں بلکہ آپ اس وقت بھی نبی تھے جبکہ ابھی جسدِ آدمؑ تخلیق و تسویہ کے مراحل سے گزر رہا تھا — اس سلسلے میں اس روایت سے قطع نظر جس میں ”اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ“ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں اس لیے کہ وہ محدثین کرام کے نزدیک مستند نہیں ہے‘ آخر اس حدیث کی کیا توجیہہ ممکن ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ ؓ قَالَ: قَالُوْا: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَتٰی وَجَبَتْ لَکَ النُّبُوَّۃُ؟ قَالَ: ((وَآدَمُ بَیْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ)) (رواہ الترمذی وقال ھذا حدیثٌ حسنٌ)

”ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ صحابہؓ نے دریافت کیا: یارسول اللہ! آپؐ کو نبوت کب ملی؟ فرمایا: ”اُس وقت جب آدم علیہ السلام ابھی روح اور جسم کے درمیان تھے (یعنی ان میں روح نہیں پھونکی گئی تھی!)۔“ ترمذی بحوالہ ترجمان السنّہ اول

ظاہر ہے کہ اس کی ایک ہی توجیہہ ممکن ہے اور وہ یہ کہ اجسادِ انسانی کی تخلیق سے بہت قبل ارواحِ انسانی خلعتِ وجود سے مشرف ہو چکی تھیں اور ان کے مابین مراتب و مناصب کے جملہ امتیازات بھی موجود تھے۔

بعد ازاں جیسے ہی آدم کے جسدِ خاکی کا ہیولیٰ تخلیق و تسویہ کے طویل مراحل طے کر کے اس قابل ہوا کہ روحِ آدم اس سے ملحق کی جا سکے تو نفخ روح ہوا اور روح و جسد کا یہ مجموعہ مسجودِ ملائک قرار پایا‘ بفحوائے آیاتِ قرآنی:

۱۔ ﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾ فَاِذَا سَوَّیْتُہٗ

---

(۱) ﴿وَعُرِضُوْا عَلٰی رَبِّکَ صَفًّا ؕ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا کَمَا خَلَقْنٰکُمْ اَوَّلَ مَرَّۃٍۢ ۫ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَکُمْ مَّوْعِدًا ﴿۴۸﴾﴾ (الکھف)

”اور وہ پیش کیے جائیں گے اپنے رب کے سامنے صف در صف (تب وہ فرمائے گا کہ) آ پہنچے ہو تم ہمارے پاس بالکل اسی طرح جس طرح ہم نے پیدا فرمایا تھا تمہیں پہلی بار۔ لیکن تم تو اس مغالطے میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ہم تمہارے لیے اس ملاقاتِ موعودہ کے لیے کوئی وقت نہ متعین کریں گے!“

وَنَفَخۡتُ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِيۡ فَقَعُوۡا لَهٗ سٰجِدِيۡنَ (٢٩)﴾ (الحجر)

''اور (یاد کرو) جب کہا تیرے رب نے فرشتوں سے 'میں پیدا کرنے والا ہوں اس سنے ہوئے گارے سے جو سوکھ کر کھنکھنانے لگا ہے ایک بشر' تو جب میں اسے پوری طرح مکمل کر چکوں اور اس میں اپنی رُوح میں سے پھونک دوں تو گر پڑنا اس کے لیے سجدے میں۔''

٢۔ ﴿اِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيۡ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنۡ طِيۡنٍ (٧١) فَاِذَا سَوَّيۡتُهٗ وَنَفَخۡتُ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِيۡ فَقَعُوۡا لَهٗ سٰجِدِيۡنَ (٧٢)﴾ (ص)

''(یاد کرو) جب کہا تیرے رَب نے فرشتوں سے: میں بنانے والا ہوں مٹی سے ایک بشر' تو جب میں اسے پوری طرح بنا کر درست کر دوں اور پھونک دوں اس میں اپنی روح میں سے تو گر پڑنا اس کے لیے سجدے میں۔''

اور پھر پوری نوعِ انسانی کو صُلبِ آدم سے متعلق کر دیا گیا۔ چنانچہ جیسے جیسے ارحامِ امہات میں افرادِ نوعِ انسانی کے اجساد تیار ہوتے رہے ایک خاص مرحلے پر جنودِ ارواح میں سے ایک ایک روح ان کے ساتھ متعلق کی جاتی رہی۔ جس کو تعبیر کیا سورۃ المؤمنون میں ''خَلۡقًا اٰخَرَ'' کے الفاظِ مبارکہ سے اور جس کی خبر دی مزید وضاحت کے ساتھ صادق و مصدوق علیہ الصلوٰۃ السلام نے۔ از روئے آیات و حدیث مندرجہ ذیل:

١۔ ﴿وَبَدَاَ خَلۡقَ الۡاِنۡسَانِ مِنۡ طِيۡنٍ (٧) ثُمَّ جَعَلَ نَسۡلَهٗ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ مَّآءٍ مَّهِيۡنٍ (٨) ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِهٖ﴾ (السجدۃ)

''اور اس نے انسان کی تخلیق کا آغاز کیا مٹی سے' پھر چلائی اس کی نسل نچڑے ہوئے بے قدر پانی سے۔ پھر اس کو درست کیا پوری طرح اور پھونکا اس میں اپنی روح میں سے!''

٢۔ ﴿وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ طِيۡنٍ (١٢) ثُمَّ جَعَلۡنٰهُ نُطۡفَةً فِيۡ قَرَارٍ مَّكِيۡنٍ (١٣) ثُمَّ خَلَقۡنَا النُّطۡفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقۡنَا الۡعَلَقَةَ مُضۡغَةً فَخَلَقۡنَا الۡمُضۡغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوۡنَا الۡعِظٰمَ لَحۡمًا ۗ ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِيۡنَ (١٤)﴾ (المؤمنون)

''اور ہم نے پیدا کیا انسان کو مٹی کے خلاصے سے۔ پھر کر دیا ہم نے اس کو ایک بوند جمے ہوئے ٹھکانے میں۔ پھر بنایا اس بوند سے ایک علقہ اور پھر بنایا اس علقہ سے ایک لوتھڑا' پھر بنائیں اس لوتھڑے سے ہڈیاں' پھر پہنایا ہڈیوں کو گوشت' اور پھر اٹھایا اسے ایک اور ہی اٹھان پر۔ سو بڑا ہی بابرکت ہے اللہ سب سے اچھی تخلیق فرمانے والا!''

٣۔ عَنۡ اَبِيۡ عَبۡدِ الرَّحۡمٰنِ عَبۡدِ اللّٰهِ بۡنِ مَسۡعُوۡدٍ ؓ قَالَ حَدَّثَنَا رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ وَ هُوَ الصَّادِقُ الۡمَصۡدُوۡقُ: ((اِنَّ اَحَدَكُمۡ يُجۡمَعُ خَلۡقُهٗ فِيۡ بَطۡنِ اُمِّهٖ اَرۡبَعِيۡنَ يَوۡمًا نُطۡفَةً ثُمَّ

يَكُوْنُ عَلَقَةً مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ يَكُوْنُ مُضْغَةً مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ يُرْسَلُ اِلَيْهِ الْمَلَكُ فَيَنْفَخُ فِيْهِ الرُّوْحَ)) (رواہ البخاری ومسلم)

ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ فرمایا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سچے ہیں اور ان کی سچائی مُسلَّم ہے کہ: ”تم میں سے ہر ایک کی تخلیق رحمِ مادر میں چالیس دن تو نطفے کی صورت میں ہوتی ہے، پھر اتنے ہی دن علقہ کی صورت میں، پھر اتنے ہی دن مضغہ کی صورت میں۔ پھر اس کے بعد ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے جو اس میں رُوح پھونکتا ہے۔“ (اس حدیث کو روایت کیا امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے)

واضح رہے کہ یہاں روح سے مراد زندگی لینا بہت بڑا مغالطہ ہے، اس لیے کہ بے جان تو نہ وہ ”بَيْضَةُ الْاُنْثٰى“ ہی ہوتا ہے جو طویل مسافت طے کر کے رحم میں پہنچتا ہے اور نہ ”نُطْفَةُ الرَّجُل“ جو نہایت جوش وخروش سے حرکت کرتے ہوئے پوری قوت کے ساتھ اس میں داخل ہوتا ہے۔ رہے علقہ اور مضغہ تو ان میں تو نشوونما کا خالص حیاتیاتی عمل انتہائی زور شور سے جاری ہوتا ہے۔ لہٰذا یہاں بے جان مادے میں زندگی پھونکنے کا کوئی سوال نہیں بلکہ جسدِ انسانی کے ساتھ جو تخلیق وتسویہ کے مراحل طے کر رہا ہے روحِ انسانی کے الحاق کا معاملہ ہے، فافہم وتدبر!

اب آیئے اصل موضوع کی طرف!

حقیقت یہ ہے کہ انسان ایک مرکب وجود کا حامل ہے، جو دو اَجزاء پر مشتمل ہے: ایک اس کا وجودِ حیوانی جو مجموعہ ہے جسم اور جان یا جسد وحیات دونوں کا اور دوسرے روحِ[1] انسانی جس کے شرف ومجد کے اظہار کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی ذات کی طرف نسبت دی! ﴿وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ﴾۔ ایک کا تعلق ہے عالمِ خلق سے جس میں تخلیق وتسویہ کا عمل لازماً تدریج وارتقاء کے مراحل سے ہو کر گزرتا ہے، جب کہ دوسرے کا تعلق ہے عالمِ امر سے جہاں ابداع اور ایجاد وتکوین کا ظہور کُن فیکونی شان کے ساتھ ہوتا ہے، بمصداقِ الفاظِ قرآنی:

۱۔ ﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ﴾ (بنی اسرائیل: ۸۵)

”اور وہ پوچھتے ہیں تم سے روح کے بارے میں۔ کہو روح میرے ربّ کے امر سے ہے!“

۲۔ ﴿وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ ۢ بِالْبَصَرِ ۵۰﴾ (القمر)

”اور نہیں ہے ہمارا امر مگر بس ایسے جیسے ایک لپک نگاہ کی!“

---

[1] اکثر لوگ روح کو حیات یا زندگی کے ساتھ خلط ملط کر دیتے ہیں حالانکہ زندگی تو جمیع حیوانات ہی نہیں نباتات تک میں ہے۔ وہ روح ربانی جس سے انسان جملہ حیوانات سے ممیّز ہوتا ہے بالکل دوسری چیز ہے۔

۳۔ ﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ (یٰسٓ)

''اور اُس کے امر کی شان تو یہ ہے کہ وہ بس کہہ دیتا ہے کہ ہو جا اور ہو جاتا ہے!''

مزید برآں —— ایک کا رجحان ہے عالمِ سفلی کی طرف جبکہ دوسرے کی پرواز ہے عالمِ علوی کی جانب' بلکہ ایک بالقُوّہ ''اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ'' (التین) کے حکم میں ہے تو دوسرے کا اصل مقام اعلیٰ ''عِلِّيِّيْنَ'' (المطففین) میں ہے' ایک خاکیُ الاصل ہے اور ''کُلُّ شَیْءٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِهٖ''⁽¹⁾ کے مصداق ﴿وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ﴾ (الاعراف:۱۷۶) کی مکمل تصویر' جبکہ دوسرا نوریُ الاصل اور ع: ''اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن!'' کے مصداق ہمیشہ عالمِ بالا کی جانب مائل و متوجّہ۔ ایک خالصتاً حیوانات کی سطح پر ہے تو دوسرا فرشتوں کا ہم رتبہ ہی نہیں بالقُوّہ ان سے بھی آگے! بقولِ شیخ سعدیؒ ؎

آدمی زادہ طُرفہ معجون است   از فرشتہ سرشتہ وز حیواں

گویا دونوں باہم متضاد و متصادم ہیں۔ چنانچہ ایک تقویت پاتا ہے تو دوسرا لازماً مضمحل ہوتا ہے اور ایک کا دباؤ بڑھے تو دوسرے کا کچلا جانا لازمی ہے! چنانچہ بطن و فرج کے تقاضوں کی بھرپور تسکین اور کثرتِ آرام و استراحت سے روح مضمحل ہوتی چلی جاتی ہے' حتیٰ کہ وہ وقت بھی آ جاتا ہے جب انسان کا جسدِ خاکی چلتا پھرتا اور کھاتا پیتا الغرض ہر اعتبار سے زندہ ہی نہیں خوب فربہ و توانا⁽²⁾ نظر آتا ہے درآنحالیکہ اس کی روح' کمزور اور لاغر ہوتی ہوتی بالآخر سسک سسک کر دم توڑ دیتی ہے اور جسد انسانی اس روح کے لیے چلتی پھرتی قبر بن کر رہ جاتا ہے' بقول علامہ اقبال ع ''روح سے تھا زندگی میں بھی تہی جن کا جسد!'' اور بمصداق الفاظِ قرآنی:

﴿اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ﴾ (النمل:۸۰' الروم: ۵۲)

''یقیناً (اے نبی ﷺ!) تم نہیں سنا سکتے (اپنی بات) مُردوں کو اور نہ سنا سکتے ہو (اپنا پیغام) بہروں کو!''

افسوس کہ دورِ حاضر میں مادہ پرستانہ نقطۂ نظر کے تسلط کے باعث روح اور جسد کے جداگانہ تشخص

---

(۱) ایک مقولہ: ہر شے اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے!

(۲) قرآن حکیم نے ایک سے زائد مقامات پر منافقین کے 'تن و توش' کی جانب خصوصی اشارے کیے ہیں مثلاً سورۃ المنافقون میں فرمایا:

﴿وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ۭ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ۭ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ۭ﴾ (آیت۴)

''اور (اے نبی ﷺ!) جب تم انہیں (یعنی منافقین کو) دیکھتے ہو تو ان کے تن و توش سے متاثر ہو جاتے ہو۔ چنانچہ جب وہ بات کرتے ہیں تو ان کی گفتگو کو بغور سنتے ہو' حالانکہ درحقیقت وہ سوکھی لکڑیوں کے مانند ہیں جنہیں سہارے سے رکھ دیا گیا ہو۔''

اور ان کے تقاضوں کے باہم متضاد و متصادم ہونے کا شعور و ادراک عوام تو کجا خواص تک کو حاصل نہیں رہا۔ حتیٰ کہ بہت سے ’جدید مفکّرینِ اسلام‘ تو اس حقیقت کبریٰ کا ذکر بھی بطرزِ استہزاء و استحقار کرتے ہیں۔ چنانچہ عصرِ حاضر کے ایک بہت بڑے ’مفکّرِ اسلام‘(۱) ”اسلام کا روحانی نظام“ کے عنوان سے ایک نشری تقریر میں فرماتے ہیں:

> ”فلسفہ و مذہب کی دنیا میں عام طور پر جو تخیل کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ روح اور جسم ایک دوسرے کی ضد ہیں، دونوں کا عالم جدا ہے۔ دونوں کے تقاضے الگ بلکہ باہم مخالف ہیں —— اسلام کا نقطہ نظر اس معاملے میں دنیا کے تمام مذہبی اور فلسفیانہ نظاموں سے مختلف ہے——“

اس ضمن میں انہوں نے ’دنیا پرستی‘ اور ’ترکِ دنیا‘ کی دو انتہائی صورتوں کی جو تردید کی ہے وہ اصولاً بالکل درست ہے، لیکن حیرت ہوتی ہے کہ ان کی توجہ اس حقیقت کی جانب کیوں منعطف نہ ہوئی کہ انسانی تاریخ میں ان دونوں انتہاؤں کی موجودگی بجائے خود اس کا ثبوت ہے کہ انسانی شخصیت میں دو بالکل متضاد اور مخالف قوتیں کارفرما ہیں جن کے مابین مسلسل رسہ کشی جاری رہتی ہے۔ چنانچہ کبھی ایک کا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے کبھی دوسری کا۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومیؔ کبھی پیچ و تابِ رازیؔ

اسلام بلاشبہ ان کے مابین توازن پیدا کرنا چاہتا ہے اور عدم توازن(۲) کو ہرگز پسند نہیں کرتا، لیکن توازن کا یہ تصور بجائے خود دلیل قاطع ہے جسد اور روح کے تضاد اور ان کے تقاضوں کے باہم متقابل و متبائن ہونے کی۔ بقول شاعر ؎

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ ای!
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش!

---

(۱) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم

(۲) اگرچہ عدم توازن کی تمام صورتیں برابر نہیں ہیں۔ چنانچہ بہت فرق ہے اس عدم توازن میں جو دنیا پرستی یا شکم پروری و شہوت پرستی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور اس عدم توازن میں جو ترکِ دنیا یا رہبانیت کی صورت اختیار کرتا ہے۔ سابقہ اُمتوں میں عدم توازن کی پہلی صورت کی مثال یہود ہیں جنہیں ”اَلْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ“ قرار دیا گیا ہے اور دوسری صورت کی مثال نصاریٰ ہیں جنہیں صرف ”اَلضَّآلِّیْن“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مزید تقابل کے لیے دیکھئے سورۃ الحدید، جس کے وسط میں یہود کا ذکر ہے جن کی دنیا پرستی نتیجہ تھی ”قساوتِ قلبی“ کا اور آخر میں متبعینِ عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے جن کی رہبانیت کو اگرچہ بدعت قرار دیا گیا لیکن اس تصریح کے ساتھ کہ تھی یہ نیکی کے جذبے ہی کی ایک غیر معتدل صورت!

واقعہ یہ ہے کہ فکر و نظر کی اس بنیادی غلطی نے تصورِ دین کی پوری عمارت ہی کو کج کر ڈالا ہے۔ چنانچہ جب 'روح' صرف زندگی کے ہم معنی ہو کر رہ گئی تو 'دین' بھی بس ایک 'نظامِ حیات' بن کر رہ گیا اور مذہب کا ایک ایسا لا مذہبی (secular) ایڈیشن تیار ہو گیا جس میں مذہب کے لطیف حقائق سرے سے خارج از بحث ہو گئے ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج! تا ثریا می رود دیوار کج!!

ایک حقیقت کی جانب مزید توجہ فرما لیجیے!

جسدِ انسانی یا انسان کا وجودِ حیوانی خاکیُ الاصل ہے' چنانچہ اس کی جملہ ضرورتیں اور اس کے تغذیہ و تقویت کا تمام سامان بھی زمین ہی سے حاصل ہوتا ہے' جبکہ روحِ انسانی قدسیُ الاصل اور ''امر ربّ'' ہے لہٰذا اس کے تغذیہ و تقویت کی ضروت بھی تمام تر کلامِ ربانی ہی سے پوری ہو سکتی ہے جسے قرآن حکیم نے روح(۱) ہی سے تعبیر کیا ہے' از روئے آیاتِ مبارکہ:

۱۔ ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ﴾ (الشوریٰ: ۵۲)

''اور اسی طرح (اے نبی ﷺ!) ہم نے وحی کی تمہیں ایک رُوح اپنے امر سے (اس سے پہلے) تم کچھ نہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا۔ لیکن (اب) بنا دیا ہے اسے ایک نور جس کے ذریعے ہدایت دیتے ہیں ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں!''

۲۔ ﴿يُلْقِى الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ﴾ (المؤمن: ۱۵)

''اِلقاء فرماتا ہے روح اپنے امر سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے!''

۳۔ ﴿يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ﴾ (النحل: ۲)

''نازل فرماتا ہے فرشتوں کو وحی کے ساتھ اپنے امر سے' اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے!''

---

(۱) یہاں اس حقیقت کی جانب بھی توجہ ہو جائے کہ وحی کے لانے والے کو بھی قرآن نے کہیں ''روح القدس'' سے موسوم فرمایا ہے اور کہیں ''الروح الامین'' سے اور مہبطِ وحی بھی قرار دیا ہے قلب کو جو دراصل بمنزلہ ''شاہ درہ'' ہے شہر روح کے لیے۔ تو حقیقت وحی کے ضمن میں بھی ایک کلید مل جاتی ہے اگرچہ یہ بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے! گویا وحی خود بھی روح' اس کے لانے والا بھی روح اور اس کا مہبط بھی روح۔ جگر کا ایک شعر اس نغمہ وحی کی ماہیت کو خوب واضح کرتا ہے ؎

نغمہ وہی ہے نغمہ کہ جس کو
روح سنے اور روح سنائے!

اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ رمضان المبارک کے پروگرام کی دو شقیں ہیں' ایک دن کا روزہ اور دوسرے رات کا قیام اور اس میں قراءت واستماعِ قرآن! اور اگرچہ ان میں سے پہلی شق فرض کے درجے میں ہے اور دوسری بظاہر نفل کے' تاہم قرآن مجید اور احادیثِ نبویہ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام دونوں نے اشارۃً اور کنایۃً واضح فرما دیا کہ یہ ہے رمضان المبارک کے پروگرام کا جزو لاینفک! چنانچہ قرآن نے وضاحت فرما دی کہ روزوں کے لیے ماہِ رمضان معیّن ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ اس میں قرآنِ مجید نازل ہوا تھا۔ گویا یہ ہے ہی نزولِ قرآن کا سالانہ جشن!

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ (البقرۃ: ۱۸۵)

''رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن مجید نازل ہوا۔''

اور احادیث نے تو بالکل ہی واضح کر دیا کہ رمضان المبارک میں 'صیام' اور 'قیام' لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ:

(۱) امام بیہقیؒ نے رمضان المبارک کی فضیلت کے ضمن میں جو خطبہ آنحضورﷺ کا 'شعب الایمان' میں نقل کیا ہے' اس کے الفاظ ہیں:

((جَعَلَ اللّٰهُ صِیَامَهٗ فَرِیْضَةً وَ قِیَامَ لَیْلِهٖ تَطَوُّعًا))

''اللہ نے قرار دیا اس میں روزہ رکھنا فرض اور اس کا قیام اپنی مرضی پر۔''

گویا قیام اللیل اگرچہ ''تَطَوُّعًا'' ہے تاہم اللہ کی جانب سے 'مجعول' بہرحال ہے!

(۲) بخاریؒ اور مسلمؒ دونوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ آنحضورﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ' وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ))

''جس نے روزے رکھے رمضان میں ایمان و احتساب کے ساتھ' بخش دیے گئے اس کے تمام سابقہ گناہ' اور جس نے (راتوں کو) قیام کیا رمضان میں ایمان و احتساب کے ساتھ' بخش دیے گئے اس کے جملہ سابقہ گناہ۔''

(۳) امام بیہقیؒ نے 'شعب الایمان' میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت کیا کہ آنحضورﷺ نے فرمایا کہ:

((اَلصِّیَامُ وَالْقُرْاٰنُ یَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ ' یَقُوْلُ الصِّیَامُ: اَیْ رَبِّ اِنِّیْ مَنَعْتُهُ الطَّعَامَ وَالشَّهَوَاتِ بِالنَّهَارِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْهِ' وَیَقُوْلُ الْقُرْاٰنُ مَنَعْتُهُ النَّوْمَ بِاللَّیْلِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْهِ' فَیُشَفَّعَانِ))

''روزہ اور قرآن دونوں بندہ مؤمن کے حق میں سفارش کریں گے' روزہ کہے گا: اے رب! میں نے اسے روکے رکھا دن میں کھانے اور خواہشات سے پس اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما اور قرآن کہے گا:

میں نے روکے رکھا اسے رات کو نیند سے پس اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما۔ تو دونوں کی سفارش قبول کی جائے گی۔"

اور اب غور فرمایئے صوم رمضان کی حکمتوں پر!

حقائق متذکرہ بالا کے پیش نظر صیام و قیامِ رمضان کی اصلی غایت و حکمت اور ان کا اصل ہدف و مقصود ایک جملے میں اس طرح سمویا جا سکتا ہے کہ —— ایک طرف روزہ انسان کے جسدِ حیوانی کے ضُعف و اضمحلال کا سبب بنے تا کہ روحِ انسانی کے پاؤں میں پڑی ہوئی بیڑیاں کچھ ہلکی ہوں اور بہیمیت کے بھاری بوجھ تلے دبی ہوئی اور سسکتی اور کراہتی ہوئی روح کو سانس لینے کا موقع ملے —— اور دوسری طرف قیام اللیل میں کلامِ ربانی کا روح پرور نزول (۱) اس کے تغذیہ و تقویت کا سبب بنے —— تا کہ ایک جانب اس پر کلامِ الٰہی کی عظمت کما حقہٗ منکشف ہو جائے اور وہ اچھی طرح محسوس کر لے کہ یہی اس کی بھوک کو سیری اور پیاس کو آسودگی عطا کرنے کا ذریعہ اور اس کے دُکھ کا علاج اور درد کا درماں ہے! —— اور دوسری جانب روحِ انسانی از سر نو قوی اور توانا ہو کر "اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز" ہو۔ گویا اس میں تقرّب اِلی اللہ کا داعیہ شدت سے بیدار ہو جائے اور وہ مشغولِ دعا و مناجات ہو جو اصل روح ہے عبادت (۲) کی اور لُبّ لُباب ہے رُشد و ہدایت کا!

یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں صوم و رمضان سے متعلق آیات (۳) میں:

اولاً —— مجرد صوم کی مشروعیت اور اس کے ابتدائی احکام کا ذکر ہوا اور اس کی غرض و غایت بیان ہوئی ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ کے الفاظ میں اور

ثانیاً —— صومِ رمضان کی فرضیت اور اس کے تکمیلی احکام کا بیان ہوا اور اس کے ثمرات و نتائج کا ذکر ہوا دو طرح پر:

ایک —— ﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴿۱۸۵﴾﴾ (البقرۃ) کے الفاظ میں، جو عبارت ہے انکشافِ عظمتِ نعمتِ قرآن اور اس پر اللہ کی جناب میں ہدیہ تکبیر و تشکر پیش کرنے سے —— اور

دوسرے —— ﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا

---

(۱) ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشّاف! (اقبال)

(۲) احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام: ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ)) اور ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ))۔

(۳) سورۃ البقرۃ، آیات ۱۸۳ تا ۱۸۷۔

دَعَانِ ...... لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ (البقرۃ) کے الفاظ میں جو عبارت ہے انسان کے متوجّہ الی اللہ و متلاشیٔ قربِ الٰہی اور مشغولِ دُعا اور محوِ مناجات ہونے سے‘ جو اصل حاصل ہے عبادتِ ربّ کا!

الغرض! صیام و قیامِ رمضان کا اصل مقصود یہ ہے کہ روح انسانی بہیمیت کے غلبے اور تسلّط سے نجات پا کر گویا حیاتِ تازہ حاصل کرے اور پوری شدت و قوت اور کمالِ ذوق و شوق کے ساتھ اپنے رب کی جانب متوجہ ہو جائے!

اب ذرا ایک بار پھر سوچیے کہ یہ ’روحِ انسانی‘ درحقیقت ہے کیا؟ جیسے کہ پہلے واضح ہو چکا ہے‘ یہ ’’اَمْرِ رَبِّی‘‘ بھی ہے اور جلوۂ ربانی بھی۔ اس کا تعلق ذاتِ خداوندی کے ساتھ بالکل وہی ہے جو سورج کی ایک کرن کا سورج کے ساتھ کہ لاکھوں اور کروڑوں میل دور آ جانے کے باوجود اپنے منبع سے منقطع اور اپنے جداگانہ وجود کے باوصف اپنی اصل سے منفصل نہیں ہے —— بعینہٖ یہی کیفیت ہے روحِ انسانی کی کہ اپنے علیحدہ تشخص کے باوجود خدا سے منفصل نہیں بلکہ متصل ہے‘ بقول عارفِ رومیؒ ؎

اتّصالے بے تکیّف بے قیاس ہست ربّ النّاس را با جانِ ناس!

گویا قلبِ انسانی کی مکین روحِ ربانی براہ راست متّصل ہے ذاتِ رب کے ساتھ اور یہی ہے وہ عظیم امانت جس کے بارِگراں کے نہ سماوات متحمل ہو سکے نہ ارض و جبال‘ لیکن جو حصے میں آئی ظَلوم و جَہول انسان(۱) کے: ؎

آسمان بارِ امانت نتواں گشت کشید قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند!

یہی وجہ ہے کہ ایک حدیثِ قدسی کی رو سے قلبِ مؤمن کی مکین خود ذاتِ الٰہی ہے:

((مَا وَسِعَنِیْ اَرْضِیْ وَلَا سَمَائِیْ وَلٰکِنْ وَسِعَنِیْ قَلْبُ عَبْدِی الْمُؤْمِنِ))

’’میں نہ زمین میں سما سکا نہ آسمان میں‘ البتہ اپنے مؤمن بندے کے دل میں میری سمائی ہوگئی۔‘‘ (احیاء علوم الدین‘ امام غزالیؒ ج ۳‘ ص ۱۴)

؎ من نگنجم در زمین و آسماں لیک گنجم در دلِ مؤمن عیاں! (سعدیؒ)

تو کیا بالکل درست نہیں یہ قول مبارک کہ ’’اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ‘‘ —— بلکہ ’’اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اُجْزٰی بِہٖ‘‘ —— اس لیے جب کہ دوسری بدنی اور مالی عبادتوں کا حاصل ہے تزکیہ و تطہیرِ نفس‘ وہاں صوم رمضان کا حاصل ہے تغذیہ و تقویت رُوح جو متعلق ہے براہ راست ذاتِ خداوندی کے ساتھ —— لہٰذا

---

(۱) سورۃ الاحزاب: ۷۲

روزہ ہوا خاص اللہ کے لیے' اب چاہے یوں کہہ لیں کہ وہ خود ہی اس کی جزا دے گا یا یوں کہہ لیں کہ وہ خود ہی بہ نفسِ نفیس اس کا انعام ہے' کوئی فرق واقع نہیں ہوتا' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ تو منتظر رہتا ہے کہ جیسے ہی کوئی بندہ خلوص و اخلاص کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہو وہ بھی کمالِ شفقت و عنایت کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہو جائے —— یہاں تک کہ ایک حدیثِ قدسی کی رو سے اگر بندہ اس کی جانب چل کر آتا ہے تو وہ بندے کی جانب دوڑ کر آتا ہے اور اگر بندہ اس کی طرف بالشت بھر بڑھتا ہے تو وہ بندے کی طرف ہاتھ بھر بڑھتا ہے —— گویا بقول علامہ اقبالؔ مرحوم ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں!
راہ دکھلائیں کسے؟ رَہروِ منزل ہی نہیں!

* * *

بقیہ: حرفِ اول

علم کا انحصار مسلک دیوبند کے مدارس پر ہی ہے؟ اگر جواب ہاں میں ہے تو بتایا جائے کہ اس کی شرعی دلیل کیا ہے؟ اگر نہیں تو کیا اہلِ حدیث مکتبِ فکر کے مدارس سے فارغ التحصیل اور سند یافتہ علماء کا ''غیر مقلد'' ہونا فاضل مصنف کے نزدیک قابلِ اعتراض نہیں؟ اور کیا مقلدین کے نزدیک غیر مقلد ہونا ایک نوع کی ''گالی'' نہیں بن گیا ہے؟ گویا مسئلہ سند یافتہ ہونے یا نہ ہونے کا نہیں بلکہ کچھ اور ہے! ہم یہ مقدمہ اس لیے پیش کرنے پر مجبور ہیں کہ زوالِ امت کا ایک یہ بھی مظہر ہے کہ آج اہلِ علم کا سارا زور' الا ماشاء اللہ' دین کی اشاعت و تبلیغ نہیں بلکہ اپنے مسلک کا تفوق اور اس کے دلائل وضع کرنے پر صَرف ہو رہا ہے اور اس کے لیے ایسی ایسی تاویلات وضع کی جاتی ہیں کہ
ع ''ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے!''

آخر میں ہم اس امر کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحبؒ اپنی تمام تر خوبیوں اور صلاحیتوں کے باوجود ایک انسان ہی تھے۔ اُن سے کوتاہیوں اور لغزشوں کا صدور اسی طرح ہی ممکن ہے جیسے کسی دوسرے انسان سے۔ لیکن خدارا انہیں زبردستی اسلاف سے الگ کر کے نہ کھڑا کیا جائے اور اس معاملے میں علمی' اخلاقی اور عقل و منطق کے تقاضوں کو پسِ پشت نہ ڈالا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حق پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے' آمین!

جہاد فی سبیل اللہ
اصل حقیقت' اہمیت و لزوم اور مراحل و مدارج
بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کا ایک جامع خطاب